سرسیّد شناسی کی روایت ــــ حالی تا حال

مجاہد حسین

Mujahid Hussain

ABSTRACT:

Sir Syed Ahmed Khan was a great scholar,reformer and educationist.He devoted himself for the progress of Muslim ummah.He was a writer,researcher and critic.Maulana Altaf Hussain Hali was the first person who wrote a book on the life of Sir Syed Ahmed Khan. From Hali to date research and critics are being written continuously on Sir Syed Ahmed Khan's works.

In this article analysis of research and critical works on Sir Syed Ahmed Khan is presented from Hali to date.

سرسید احمد خاں ایک مستقل مزاج اور آہنی عزم کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ صرف خود اردو نثر کے فروغ کے لیے کام کیا بلکہ اپنی سحر انگیز شخصیت کے حصار میں اور بھی کئی رفقا کو لیا اور اردو نثر کے دامن کو وسعت بخشی۔ سرسید احمد خاں نے اپنی مختلف کتب مضامین اور تقاریر وغیرہ کے ذریعے یہ کوشش کی کہ انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے مابین فاصلے کم ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنے دور کے حالات کا جائزہ بہ نظرِ عمیق لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانانِ ہند کی حالت میں اس وقت تک بہتری نہیں آسکے گی جب تک کہ مسلمان جدید مغربی علوم حاصل نہ کر لیں۔ سرسید احمد خاں کے زمانے ہی میں بہت سے لوگ انھیں ایسے میسر آئے جو ان کے مدد و معاون بنے اور ان کے نظریات کے فروغ میں ان لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا۔ بہت سے صاحبان ایسے بھی تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں کا اس لیے ساتھ دیا کہ وہ مسلمانوں کی خیرخواہی اور دنیاوی ترقی کی بات کرتے تھے لیکن جب انھوں نے سرسید کے خیالات و نظریات کو پوری طرح سمجھا اور خصوصاً ان کے مذہب سے متعلق نظریات کو جانا تو ان سے گریزپا ہو گئے۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ابتدا ہی سے سرسید احمد خاں کے کام، ان کے طریقہ کار اور ان کے نظریات سے اختلاف کیا اور سختی سے اپنے موقف پر

لیکچرار اُردو، ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

آخر تک قائم رہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کو تینوں طبقوں کا سامنا رہا۔ ایک وہ جنھوں نے عزت و توقیر کے اونچے بانس پر بٹھایا۔ دوسرے وہ جنھوں نے بعض اقدامات کی تائید و حمایت کی اور بعض اقدامات کی مخالفت کی اور ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے اول تا آخر سرسید احمد کے اقدامات کی مخالفت کی اور ان کے مشن اور ان کے نظریات کو نہ صرف تسلیم نہ کیا بلکہ کھلے لفظوں میں اس کی مذمت بھی کی۔ یہ تینوں طبقے آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔

سرسید کے حوالے سے اظہارِ خیال کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جہاں ان کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا وہاں انھیں ان کے نظریات کی وجہ سے ہدفِ تنقید بھی بنایا گیا۔ ایک طرف حالی تھے تو دوسری طرف ''اودھ پنچ'' سے وابستہ لکھنے والے تھے۔ ایک اور رخ علامہ شبلی نعمانی بھی تھے جنھوں نے غلط مذہبی نظریات پر سرسید کی گرفت بھی کی، مگر دلائل کے ساتھ سرسید کی ذات، ان کے مقاصد اور ان کے نظریات کے حوالے سے اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر ایک مفصل کتاب بھی حیاتِ جاوید کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک طرف تو سرسید احمد خاں کی شخصیت کے متعلق لکھا اور دوسری طرف ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ ناقدین نے اسی کتاب کو سرسید کی مدلل مداحی بھی قرار دیا۔ اس کتاب کے حوالے سے تاریخ ادبِ اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> ''حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے انھوں نے حیاتِ ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور کثیر الاشغال زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔۔۔ ہر ایک مہتمم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے۔''(۱)

اس کتاب میں مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے ہم پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی تھا کہ انھوں نے یہ سبق دیا کہ اب ہمیں دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اس لیے وہ لیاقتیں اور صلاحیتیں جو دنیا میں کشور کشائی اور حکومت و سلطنت کے لیے درکار ہیں ہمارے لیے بے سود ہیں لہٰذا اب ہمیں محکوم بن کر رہنا سیکھ لینا چاہیے۔ مولانا حالی کے خیال میں یہ سرسید احمد خاں کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

مولانا حالی گو سرسید کے بڑے خیر خواہ تھے لیکن انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ خصوصاً انھوں نے سرسید احمد خاں کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر پر اعتراضات اٹھائے۔ مولانا

حالی کے ان اعتراضات کی جھلک حیات جاوید میں بھی موجود ہے اور مقالاتِ حالی میں بھی۔ اس حوالے سے مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

''آخر میں سرسید کی خودآرائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔''(۲)

مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کی لکھی ہوئی تفسیر کے حوالے سے اپنے مقالات میں بھی اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں!''(۳)

علامہ شبلی نعمانیؒ کا نام اردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ سوانح نگار، نقاد، شاعر، عالم دین، ماہرِ تعلیم، سفر نامہ نگار، خطیب، معلم، مکتوب نگار، مقالہ نگار، سیرت نگار اور مورخ ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کا بھی سرسید احمد خاں کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا۔ ابتدا میں وہ بھی سرسید کی طرح جدت پسند تھے اور عقلیت کا ان پر غلبہ تھا لیکن سرسید احمد خاں کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سرسید کے خیالات سے اختلاف کرنے لگے اور بعد ازاں یہ اختلافات بڑھتے گئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''شبلی جو سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور بقول شرر ان کی فوج کے ایک نامی گرامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ ابتدا میں وہ بھی سرسید کی طرح جدت پسند تھے لیکن سرسید احمد خاں کی ساڑھے چودہ سالہ صحبت نے ان کے ذہن کو تبدیل کر دیا۔ وہ جدت پسندی کی تنگ ناؤ سے نکل آئے۔۔۔ سرسید کی مغرب زدگی ان کو اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔''(۴)

شبلی نعمانی چونکہ سرسید کے قریبی ساتھی رہے تھے اس لیے وہ سرسید احمد خاں اور ان کے نظریات کو دوسروں کی نسبت بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے اختلاف کا کھل کر اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سرسید احمد خاں کی اس روش کے بھی سخت خلاف تھے کہ علی گڑھ کالج میں عربی زبان کی تعلیم کی تحقیر کی جاتی تھی۔ وہ انگریزی زبان کی تعلیم کے مخالف نہ تھے اور نہ ہی جدید سائنسی تعلیم کے مخالف تھے لیکن اس بات پر سرسید کے سخت مخالف تھے کہ وہ عربی زبان کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ عربی ہماری مذہبی زبان نہیں ہے، یہ

صرف قرآن کی زبان ہے اور قرآن پڑھ لینا کافی ہے۔ علامہ شبلی نے سرسید کے ان تصورات ونظریات پر کڑی نکتہ چینی کی اور سرسید کے اس رویے کو سخت ناپسند کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

''میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر میں ارکانِ کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ ''ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے'' نہایت ظلم اور ناانصافی ہے۔''(۵)

مولوی مشتاق حسین اور نواب وقار الملک بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے عمر بھر سر سید احمد خاں کے ساتھ تعلق برقرار رکھا۔ علی گڑھ کالج کے ساتھ ان کا تعلق بہت مضبوط تھا۔ نواب وقار الملک نے زندگی بھر سرسید کا ساتھ دیا مگر نواب صاحب کو سرسید کے نظریات سے اختلاف رہا۔ ان نظریاتی اختلافات کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے سرسید کے نام ایک خط میں تہذیب الاخلاق میں چھپنے والے ان مضامین پر بھی اعتراض کیا جن کے ذریعے سے سرسید کے مذہبی نظریات اور انگریزی حکومت کی تقلید اور فرماں برداری کے خیالات ونظریات کو عام کیا جارہا تھا۔ انھوں نے ایک اور خط میں سرسید کو یہ بھی لکھا کہ جس بات کو صرف اپنے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں اس طرح آپ کو دوسروں کی رائے کا بھی احترام کرنا چاہیے اور دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنی نہیں چاہیے۔ انھوں نے مولانا حالی کے نام ایک خط میں سرسید کی کارپوریشن نواز پالیسی پر رفقائے کار کی گہری تشویش کا بھی اظہار کیا۔

نواب وقار الملک نے سرسید کے نام ایک خط میں سرسید کے مذہبی نظریات پر اعتراض کیا اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں سرسید کے بعض جملوں پر سخت اختلاف کیا اور یہ بات لکھی کہ میں ایسی ہستیوں پر تبرا سننے کو تیار نہیں ہوں۔ نواب وقار الملک نے سرسید کے نام ایک خط میں لکھا:

''(بنام سرسید)۔۔۔ فقہ حنفیہ کی وہ کتابیں ''جن میں سراسر حیلہ ہی بھرا پڑا ہے'' میں نے نہیں پڑھیں، پس مجھے اس کا طعنہ فضول ہے۔ اور آج کل اس غریب فقہ کا حُلیہ کس شمار میں ہے جہاں قانون میں ایسی ایسی باریکیاں موجود ہوں اور مفتیانِ زمانہ میں ایسے ایسے عالی دماغ موجود ہوں۔''(۶)

سید مہدی علی خاں، نواب محسن الملک بھی سرسید کے رفقا میں شامل تھے۔ وہ بھی سرسید احمد خاں کے ساتھ علی گڑھ کالج کے انتظامی معاملات میں شامل رہے اور سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے ہی علی گڑھ کالج کو سنبھالا اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ نواب محسن الملک کا شمار جہاں سرسید کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے وہاں وہ سرسید کے مذہبی نظریات کے سخت ترین ناقد تھے۔ ان کے سرسید کے نام لکھے ہوئے کئی خط موجود ہیں جن میں انھوں نے سرسید کے مذہبی

نظریات پر سخت تنقید کی ہے۔

نواب محسن الملک نے سرسید احمد خاں کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ آپ نے یورپ کے ان لوگوں کے خیالات کو صحیح مان لیا جو پوری طرح سے مذہب کے پابند اور معتقد نہیں۔ آپ نے ان نظریات کی بنیاد پر قرآن حکیم کی آیات کی غلط تاویل وتفسیر کی۔ آپ نے مسلمان مفسروں کو تو خوب گالیاں دیں اور انھیں یہودیوں کا مقلد بتایا مگر آپ نے خود یورپ کے لا مذہبوں کی مکمل تقلید کی اور آیات قرآنی کی غلط تاویلیں پیش کیں۔ اس حوالے سے وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ آپ نے یورپ کے لا مذہبوں کی تقلید میں بعض جگہ تو قرآن مجید کے وہ مطالب سمجھے جو آج تک کوئی دوسرا نہ سمجھ سکا۔ وہ سرسید کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ:

''میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہنچ کر آپ کو ٹھہرنا چاہیے تھا، اُس سے گزر گئے۔ آپ نے اُن باتوں کو، جو اس زمانہ کے علم وسائنس نے پیدا کی ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی مخالف معلوم ہوئیں اُس میں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔''(۷)

شمس العلماء خان بہادر مولوی نذیر احمد کا شمار بھی سرسید کے خاص رفیقوں میں ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد بھی سرسید کی طرح مسلم امہ کے خیر خواہ تھے اور مسلمانانِ ہند کی خیر خواہی چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی سرسید احمد خاں کی کتب، رسائل یا کسی اور تحریر کو نہیں خریدا کیونکہ وہ سرسید کے نظریات سے متفق نہیں تھے بلکہ ان کے نقاد تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوانِ حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنّفین نے چوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے) قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل۔''(۸)

مولوی صاحب کی اس تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سرسید کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ بعض معمولات میں ان سے اختلاف رکھتے تھے۔

سید امداد العلی کا شمار برصغیر کے نامور اہل قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی سرسید کی پالیسیوں اور ان کے نظریات سے سخت اختلاف کیا اور اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کی تجویز کے مخالفوں کو خبیث النفس، بد باطن، خود غرض، حاسد اور ترقی پر خفا ہونے والے متعصب وہابی وغیرہ قرار دیا۔ کسی کو بدتمیز اور نادان قرار دیا، ان کا کہنا ہے:

''عام مسلمان سید احمد خاں صاحب کو ایک شخص ناخواندہ و ناکارآزمودہ حقائق علوم اور دقائق فنون سے جانتے ہیں، جس کو کسی علم میں کسی مسئلے کے صحیح طور پر سمجھنے کی بھی کچھ قدرت نہیں اور امور دینی میں ان کی رائے ملحدانہ ہے اور غیر امور دینی میں ان کی تقریر اور تحریر جاہلانہ۔''(۹)

عبدالحق حقانی کے نام سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے بھی تفسیر قرآن میں بیان کردہ سر سید احمد خاں کے خیالات و نظریات پر ان کی کڑی گرفت کی ہے۔ اپنی کتاب تفسیرِ حقانی کے مقدمے میں عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:

''سترھویں صدی میں فرانس اور جرمنی میں سینکڑوں ایسے لوگ صاحب تصنیف ظاہر ہوئے کہ جو صرف خدا کے قائل تھے، باقی انبیاء اور ان کے معجزات اور امورِ آخرت اور جن وملائکہ بلکہ وجودِ آسمان سب کو قصہ کہانی جانتے تھے اور پھر انگلستان میں بھی اس کا چرچا پھیلا۔''(۱۰)

علی بخش خاں بھی سر سید کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں سر سید احمد خاں کے نظریات پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ ہماری قوم کو جدید علوم کی ضرورت ہے۔ مجھے اس بات پر سخت افسوس ہے کہ سر سید احمد خاں جیسا شخص جسے اللہ تعالیٰ نے ناموری، عزت و توقیر دی اور عقل و شعور بھی بخشا اور انھوں نے قومی ترقی کا ارادہ بھی ظاہر کیا وہ مسلمانوں کو جدید علوم لکھانے کی بجائے مذہبی نظریات کے ساتھ دست اندازی کرنے لگے اور مذہبی نظریات کو درست کرنے کا جنون اس حد تک بڑھا کہ انھیں اس کے سوا اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کو ان سے نفرت ہوگئی اور میں بھی ان کا جس قدر مخالف ہوں اس کی وجہ ان کے مذہبی نظریات ہیں۔ علی بخش خاں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جو تفسیر کہ اب حضورِ والا نے ایجاد کی ہے۔۔۔ رسولؐ، بعدہ صحابہ و تابعین، مفسرین، محدثین۔۔۔ کسی ایک نے بھی آپ کے موافق تفسیر آیات قرآنی کی نہ بنائی، نہ کچھ ایسا وقیق مضمون تھا کہ حضور والا کے سوا، بارہ سو برس تک کسی کو نہ سوجھا، سب کے سب غلط تفسیر کرتے رہے۔''(۱۱)

علی بخش خان بھی سر سید کے مخالف تھے وہ سر سید کے ساتھ رہے، ان کا زمانہ دیکھا، میرے خیال میں سر سید کی تعلیم اور افکار کو علی بخش خاں سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا مگر علی بخش خان کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

محمد قاسم نانوتوی کا نام بھی سر سید شناسی کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نے انگریزی حکومت کے زمانے میں بڑی ہمت اور پامردی سے قدیم اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے۔ وہ قدیم روایت کے حامی تھے اس لیے انھیں جدید علوم یعنی انگریزی مضامین سے سخت نفرت تھی یہی نفرت

سرسید کی مخالفت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ وہ معروف عالم دین تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب دین کی کم فہمی اور دین سے دوری ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر دینی شعور پوری طرح سے اجاگر ہو جائے اور وہ دینِ اسلام کو اپنے عمل کا جز ولازم بنالیں تو آج بھی مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کی ہاں سے ہاں ملانا ہم سے جب ہی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو اُن کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کئے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے۔۔۔کوئی کچھ کہے وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ اُن کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔''(۱۲)

میر ناصر علی دہلوی بھی سرسید کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں سرسید احمد خاں کے باطل نظریات سے اختلاف کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض نیچریوں نے ایک قسم کا دہریہ پن مع خدا کے نکالا مگر اہلِ ایمان نے کبھی ان پر اعتبار نہیں کیا۔ نیچری بھی اپنے نظریات کو کسی مذہب سے نہ ملا سکے۔ سرسید احمد خاں جب ولایت گئے تو وہاں انھوں نے نیچریت کا چرچا دیکھا۔ یورپ میں نیچریت کے علمبردار تو ہر مذہب کو نیچر کے خلاف بتاتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نیچری ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی نہ جانتے تھے کہ نیچر اور نیچریت کیا ہے اور ان کے بنیادی عقائد کیا ہیں۔ اس حوالے سے میر ناصر علی دہلوی نے لکھا ہے کہ:

''تحقیقات نیچریہ میں اسلام پر ایمان کہاں؟ یہ سید احمد خاں کی ایجاد ہے کہ دونوں سے لڑے۔ نہ نیچر کو مانے اور نہ عقائد اسلام کو سچا جانے۔''(۱۳)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں سرسید احمد خاں کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے۔ اس حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ:

''سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آ گئی۔ طبیعت چونکہ موجودہ وسابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی اور ماحول میں کوئی غالب موثر موجود نہ تھا اس لئے قدرتی طور پر اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا۔''(۱۴)

مولانا آزاد کے ہاں سال بھر یہ کیفیت اپنے عروج پر رہی لیکن اس کے بعد وہ منزل سامنے نظر آنے لگی جو اس کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی یعنی الحاد۔ جب یہ حالت ہوئی تو سرسید کے مسلک کی جدت وغرابت کا اثر دھیما پڑنے لگا اور طبیعت آہستہ آہستہ اپنے اصل پر آنے لگی۔ اب یہ محسوس ہونے لگا کہ سرسید نے مذہب کے عقائد ونظریات کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا تھا لیکن اب انھیں سرسید کے نظریات بھی وہم وخیال نظر آنے لگے۔ اس کے بعد سرسید کے نظریات سے طبیعت اچاٹ ہو گئی۔

جو دروازہ سرسید کے نظریات نے کھولا تھا اس نے بالآخر شکوک وشبہات کی ایک نئی راہ دکھائی۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سر سید کے مذہبی نظریات کو اپنی تحریروں میں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ صدی کی بے دینی، مذہبی بے راہ روی، بدعقیدگی اور مذہب بیزاری کی اصل جڑ سرسید احمد خاں کے نظریات تھے۔ سرسید احمد خاں کے دو دشمن تھے، ایک انگریز کے دشمن اور برصغیر کی آزادی کے خواہشمند اور دوسرے علمائے دین۔ دراصل علمائے دین ہی انگریزی حکومت کے سب سے بڑے دشمن تھے۔۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث میں، ادب کے سنجیدہ مضامین میں، تمثیلوں اور تجزیوں میں انھوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز وتعریض اور تضحیک وتمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔''(۱۵)

اصغر علی روحی نے بھی سرسید کے خیالات ونظریات بنظر استحسان نہیں دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت کو انگریزی رنگ میں رنگنا چاہا اور مسلمانوں کے مذہبی نظریات کی بھی ایک نئی بنیاد رکھنا چاہی مگر وہ دونوں حوالوں سے کامیاب نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر نے سرسید احمد خاں کے بعض نظریات کی تحسین کی ہے اور بعض پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ ان کے نزدیک جدید مذہبی نظریہ فکر سرسید کی عظمت کی دلیل ہے۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات اور پیچیدہ مسائل کو جس عقل وفہم اور شرح کے ساتھ واضح کیا اور غیر ضروری جزئیات کو مذہب سے خارج کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔ ایسے نازک دینی نظریات کی تصحیح کا کام سرسید جیسا باحوصلہ، باہمت اور عقل وفہم رکھنے والا انسان ہی کرسکتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہاں سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے ان کے اپنے دور کے علماء، اُن کے رفقائے کار اور عام مسلمانوں نے اختلاف کیا وہاں ان کے بعد آنے والوں نے بھی سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات کو قبول نہیں کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے:

> ''ایسے لوگ معقول تعداد میں کبھی نہیں رہے جنھوں نے مذہبی افکار میں سرسید کے ساتھ اتفاق کیا ہو۔ طلبائے علی گڑھ کی پچھلی نسلیں شاید اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن ان کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اس مصلح نے ترجمانی مذہب کے معاملے میں جن لبرل خیالات اور مذہبی رواداری سے کام لیا اس کو انھوں نے مذہب سے اپنی بے پروائی کے واسطے ایک سہل جواز کے طور پر تو استعمال نہیں کیا۔ آج کے علی گڑھ کے متعلق اگر کوئی صحیح بات کہی جا

سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے اپنے بانی کے خیالات کے مذہبی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ''(۱۶)

پروفیسر رشید احمد صدیقی عمر بھر علی گڑھ سے وابستہ رہے مگر سرسید کے افکار و خیالات سے متفق نہ ہوئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مطابق سرسید احمد خاں جس طرح انگریزوں اور انگریزی حکومت کی تقلید کرتے تھے اور ان سے متاثر تھے اس سے نہ تو حالی اور شبلی متفق تھے اور نہ مولوی نذیر احمد۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے۔ آنے والے دور نے یہ بات ثابت کی کہ جہاں تک مغربیت اور اس کے بداثرات سے بچنے اور اس سے احتیاط کا سوال تھا اس میں سرسید اور سید امیر علی سے زیادہ صاحبِ نظر مولویوں کا طبقہ نکلا۔ حالی، شبلی اور مولوی نذیر احمد نے ابتدا میں ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ تقلید مغرب کے کیا اثرات سامنے آئیں گے۔ اسی طرح اکبر کا نقطۂ نظر بھی بہتر اور مبنی بر حقیقت تھا۔ ان کے خیال میں اکبر سرسید سے زیادہ دور تک دیکھتے تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا، نہ شبلی کو اور نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے لیکن پچاس سال بعد یہی معلوم ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا، سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحبِ نظر نکلا!''(۱۷)

سرسید احمد خاں مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں۔ وہ تقلید کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے مگر مغرب کی پیروی میں انھوں نے بالکل الگ روش اختیار کی اور مغرب کی کامل تقلید کی۔ سرسید اپنی قوم کے ساتھ دردمندی رکھتے تھے اور اس حوالے سے ان کی ذات پر شبہ کرنا مشکل ہے۔ مزید یہ کہ وہ فلسفہ جدید کے ماہر تھے اسی لیے وہ نہ تو مذہب کو پوری طرح سمجھ سکے اور نہ ہی فلسفہ جدید کے مباحث کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

میں یہاں سید طفیل احمد منگلوری کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے یہ باور کرایا کہ سرسید نے اصلاح معاشرت کے سلسلے میں بہ کثرت مضامین لکھے مگر یہ مضامین انگریزی تہذیب و ثقافت کا پرچار تھے۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، جوتے پہن کر نماز پڑھنا اور ایسی کئی اور باتیں مذہبی حوالے سے سرسید نے ثابت کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سید منگلوری اُن سے متنفر تھے۔ اُنھوں نے سرسید کی شخصیت کو شیشے میں اُتارنے کی بجائے لوگوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔ اُن کے معاصرین میں ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، زاہد چوہدری، سعید اکبر آبادی اور ریاض الرحمن شروانی کے نام بھی اس حوالے سے اہم ہیں۔ یہ سب لوگ منگلوری صاحب کی حمایت بھی کرتے ہیں اور اپنے انداز میں سرسید کی حقیقت بتانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا نام سرسید شناسی کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے ان مؤرخین کواپنی تحریروں میں آڑے ہاتھوں لیا جنھوں نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کوتاریخ کا حصہ نہیں سمجھا،جنھوں نے برصغیر کی آزادی اور انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت کرنے والے حریت پسندوں کونظر انداز کیا،جنھوں نے محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الہند مولانا محمودالحسن جیسی شخصیات کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا،جنھوں نے تحریک خلافت کے کردار کونظر انداز کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف ڈٹ جانے والے بہادروں کی بہادری کا بھی اعتراف نہیں کیا۔ وہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیاانھیں اِن لوگوں کی قربانیاں نظرنہیں آتیں۔

محمد امین زبیری نے بھی علی گڑھ کالج کے طلبہ میں انگریزی حکومت کی وفاداری کا اعتراف اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔ نیز انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ علی گڑھ کے طلباء قابلیت کے اعتبار سے انگلستان کے اداروں کے برابر تھے۔ بڑے بڑے انگریز افسران، وائسراؤں اور ضلعی حکام نے کالج کو بڑے بڑے فائدے پہنچائے اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کوسرکاری ملازمتوں میں دوسرے طلبہ پر ترجیح دی گئی۔ اسی ادارے نے کانگریس کا زوروشور کم کرنے اور مسلمانوں کوکانگریس کے اثرات سے بچانے کے لیے بھی کام کیا۔اسی ادارے نے مسلمانوں کے دامن سے غداری کے داغ دھوئے اوران کے اندر سے تعصب و جہالت کو دور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی کالج نے انگریزی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں بلکہ وفادار ہیں۔انگریزی حکومت نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ یہاں کے طلبہ اور وابستگان علی گڑھ انگریزی حکومت کے وفادار اور خیر خواہ ہیں۔

عصرِ حاضر میں ضیاء الدین لاہوری نے سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار پر کئی حوالوں سے بحث کی ہے۔انھوں نے نصف درجن کتب سرسید پر لکھی ہیں جوسرسید شناسی کی روایت میں اضافہ ہے۔انھوں نے ثابت کیا ہے کہ سرسید احمد خاں ہندوستان میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مشترکہ قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ضیاء الدین صاحب نے جہاں سرسید احمد خاں کے خیالات ونظریات اوران کی تعلیمی کوششوں کا ذکر کیا ہے وہاں انھوں نے اس بات پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا ہے کہ سرسید احمد خاں نے تعلیم نسواں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ وہ تعلیم نسواں کے شدید ترین مخالف تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ مردوں کوتعلیم دینے سے عورتیں خود بخود تعلیم یافتہ ہو جائیں گی اس لیے انھوں نے ہر ایسے اقدام کی مخالفت کی جن کا مقصد عورتوں کی تعلیم کوفروغ دینا تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کئی اجلاس ایسے تھے جن میں تعلیم نسواں کی تجاویز پیش کی گئیں مگر سرسید نے ہمیشہ ایسی تجاویز کی مخالفت کی۔ان کا کہنا تھا کہ خواتین کوتعلیم دلانا ان کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ان کوقرآن پڑھا دینا اور عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم دے دینا کافی ہے۔ عام مسلمان اور سرسید کے رفقاء اس حوالے سے سرسید سے اختلاف رکھتے تھے مگر سرسید اپنے نظریات پر آخر تک قائم رہے۔

مضمون کے آخر میں حاصل کلام کے طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ سر سید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کے دورِ ابتدا میں مسلمانوں کی رہنمائی کی ۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے تعلقات استوار کیے تا کہ مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے ۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلم نو جوانوں کو جدید مغربی علوم سے بھی روشناس کرایا تا کہ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں اور معاشرے میں عزت اور وقار حاصل کر سکیں ، ہندو تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے تھے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے ۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ۔ سر سید احمد خاں نے جدید مغربی علوم با قاعدہ حاصل نہ کیے تھے اور اسی طرح وہ دینی علوم کے بھی ماہر نہ تھے اس لیے جب انھوں نے مذہبی افکار و نظریات کا جدید علوم کی روشنی میں جائزہ لینا شروع کیا تو ان سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں ۔ ان کے نظریات کے حوالے سے جب مخالفت کا آغاز ہوا تو وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے اور پھر اپنے نظریات کا دفاع کرتے کرتے بہت سی ایسی باتیں بھی کر گئے جو اسلام کے بنیادی نظریات سے متصادم تھیں ۔ سر سید احمد خاں کے مذہبی نظریات بہت سے حوالوں سے درست نہ تھے اور ان کی بنیاد یورپ کے ملحدانہ نظریات پر تھی ۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر بھی انھی نظریات کی روشنی میں لکھنے کی کوشش کی اور جا بجا ٹھوکریں کھائیں ۔

حوالہ جات

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، گلوب پبلشرز، لاہور: ۱۹۸۶ء ص ۴۷۳

۲۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء، ص ۵۰۲

۳ مولانا الطاف حسین حالی، مقالاتِ حالی، جلد اوّل، کراچی: انجمن اردو پاکستان، ۱۹۵۵ء، ص ۲۲۵

۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ، روئیداد صد سالہ برسی علامہ شبلیؒ کانفرنس، گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری لاہور: ۲۰۱۵ء ص ۲۵

۵۔ علامہ شبلی نعمانی، بحوالہ: سرسید تحریک کا ردعمل (ڈاکٹر صدیقہ ارمان) علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی: ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۷

۶۔ نواب وقار الملک، بحوالہ: سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز، (مرتبہ یوسف حسن) یونیورسٹی پریس علی گڑھ: ۱۹۶۶ء ص ۱۸۵

۷۔ نواب محسن الملک، تحریر فی اصول التفسیر، سرسید احمد خاں، مطبع مفید عام آگرہ: ۱۸۹۲ء، ص ۲۲

۸۔ مولوی نذیر احمد، موعظۂ حسنہ، مطبع انصاری دہلی: ۱۳۰۸ھ ص ۱۷۵

۹۔ سید امداد العلی، امداد الآفاق بحوالہ سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی: ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۹

۱۰۔ عبدالحق حقانی، تفسیر حقانی جلد دوم، دارالاشاعت تفسیر حقانی دہلی: ۱۳۵۷ھ، ص ۱۲۷

۱۱۔ علی بخش خاں، شہاب ثاقب، مطبع نول کشور، لکھنؤ: ۱۸۷۳ء، ص ۶۸

۱۲۔ محمد قاسم نانوتوی، تصفیۃ العقائد، دارالاشاعت کراچی: ۱۹۷۶ء ص ۸

۱۳۔ میر ناصر علی دہلوی، مقاماتِ ناصری، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۳

۱۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی، (عبدالرزاق ملیح آبادی) مطبوعاتِ چٹان لاہور: ۱۹۶۲ء، ص ۳۶۸

۱۵۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، مرتبہ ضیاء الدین لاہوری، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز: ۲۰۰۵ء، ص ۲۳

۱۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں (ضیاء الحسن فاروقی) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی: ۱۹۸۷ء ص ۷۷

۱۷۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، نگار، اکبر الہ آبادی نمبر، کراچی: ۱۹۶۴ء، ص ۳۰